© rasailojaraid.com

نماز میں دیگر مادی فوائد بھی بہت ہیں۔ فطرت انسانی اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان میں پابندیٔ وقت ہونا چاہیئے۔ اگر انسان وقت کا پابند نہیں تو اس سے خود اسی کو بہت کچھ نقصان پہونچ سکتا ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی یہ بات نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے جو اس شخص سے ذرا سا بھی تعلق رکھتے ہوں۔ انسان میں اگر پابندیٔ وقت نہیں تو دنیا کا کوئی کام صحیح و درست نہیں رہ سکتا۔ دنیا میں ہر کام کے لئے ایک وقت معین ہوا کرتا ہے اسلام نے نماز کے ذریعہ انسان کو پابندیٔ وقت کا درس دیا تاکہ اس کے لئے دنیاوی مسائل میں کوئی دقت و رکاوٹ پیدا نہ ہو اور دنیا کے کاموں میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔ اسلام نے نماز کو پانچ وقت کے لئے واجب قرار دیا تاکہ انسان دن میں کم از کم پانچ مرتبہ پابندیٔ وقت کی مشق کرے اور اسی طرح مشق کرتا رہے اور ایک وقت وہ آجائے جب وہ وقت کا واقعاً پابند ہو جائے۔

(باقی آئندہ)

حضرت ابو بکر صدیق

کے سرکاری خطوط

صفحات ۲۱۶ بڑا سائز — قیمت چار روپے مجلد پانچ روپے

خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وہ تمام خطوط مع اصل و ترجمہ یکجا کئے گئے ہیں جو خلیفۂ اول نے اپنی خلافت کے پُر آشوب اور ہنگامہ خیز دور میں حاکموں، گورنروں اور قاضیوں کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ ان مکتوبات اور فرامین کے مطالعہ سے حضرت صدیق اکبر کی لاثانی انتظامی خصوصیات اور طریق کار سامنے آجاتا ہے۔

اس ترتیب و تفصیل کے ساتھ ایسا مجموعہ اب تک وجود میں نہیں آیا تھا، اردو ترجمہ کے ساتھ خطوں سے متعلق ضروری تفصیل دی گئی ہے، شروع میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خاص حالات سے متعلق ایک بصیرت افروز تعارف۔ آخر میں عربی کے اصل مکتوبات مرتب صورت میں دیئے گئے ہیں۔ مرتبہ ڈاکٹر خورشید احمد فارق۔

پتہ:- مکتبہ برہان۔ دہلی ۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات

(۳)

سعید احمد اکبر آبادی

مونٹریل کے ہوائی اڈہ کی عمارت بہت وسیع اور بڑی شان دار ہے۔ جہاز سے اتر کر ہم لوگ ایک عمارت میں داخل ہوئے جس میں مختلف دفاتر اور مختلف سمتوں میں جانے والے مسافروں کے لئے وسیع و کشادہ اور بہترین فرنیچر سے آراستہ دو رویہ کمرے تھے۔ ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک دراز و فراخ درمیانی راستہ (CORRIDORE) میں ہو کر ایک اور عمارت میں پہنچے۔ یہاں پاسپورٹ اور کسٹم وغیرہ کے رسوم و ضوابط وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔ قلی، مزدور اور باربرداری کا تو کہیں نام و نشان ہی نہیں ہر شخص کو مرد ہو یا عورت۔ جوان ہو یا بوڑھا سامان خود ہی اٹھانا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس کے عادی ہیں اس لئے ان کو نہ گرانی ہوتی ہے اور نہ تعب اور ہر ایک اپنے ساتھ سامان بھی اتنا ہی رکھتا ہے جسے وہ لاد سکے۔ مجھے بعض عمر رسیدہ اور بعض ڈھلان پان نوجوان خواتین کو دیکھ کر ترس بھی آیا کہ وہ دو سوٹ کیس۔ ایک اس ہاتھ میں اور ایک اس ہاتھ میں۔ اٹھائے جھکی جھکائی چلی جا رہی ہیں۔ مگر اس معاملہ میں وہاں کسی کو کسی پر رحم نہیں آتا اور ہر شخص "بمتاعِ خویش مشغلے دارد" کا مصداق ہوتا ہے۔ میرا سامان اگرچہ ایک بڑے سوٹ کیس یا اور چمڑہ کے تھیلا (PORTFOLIO) کے علاوہ دو چھوٹے سوٹ کیسوں پر مشتمل تھا مگر چونکہ عادت تھی نہیں اس لئے ان کو لاد کر اتنی طویل مسافت طے کرنا دو بھر ہو گیا۔ دم پھول پھول گیا۔ لیکن شرم کے مارے نہ کہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسکرا نے کھڑا ہوا اور نہ بقول شخصے کاندھا بدلا۔ سب مسافروں کے ساتھ ساتھ میں بھی چلتا رہا۔ کسٹم وغیرہ کے ضوابط کی خانہ پری کر کے چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ ڈاکٹر جے۔ سی آڈم اور جناب ظفر اسحٰق ملے۔ میری جب ان سے نظریں چار ہوئیں تو اگرچہ یہ پہلی ملاقات تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا۔

ڈاکٹر آڈم اس زمانہ میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ اب پروفیسر اسمتھ کے ہارورڈ یونیورسٹی میں منتقل ہو جانے کے بعد۔ وہ ڈائرکٹر ہیں۔ وہ جتنے لائق اور فاضل ہیں اتنے ہی خوش اخلاق۔ بے تکلف اور شگفتہ مزاج انسان ہیں۔ عالم اسلام کی سیاحت کئے ہوئے ہیں "اسلامی جماعت" پر کئی سال سے کتاب لکھ رہے ہیں اور اس سلسلہ میں پاکستان میں طویل قیام کر کے جماعت کے بانی اور اس کے حامیوں اور مخالفوں سے ملاقاتیں کر چکے ہیں۔ عربی اچھی خاصی جانتے ہیں۔ اردو بھی مطلب سمجھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ جرمنی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور ہے۔ نسلاً و وطناً امریکن ہیں اس لئے انگریزی تو مادری زبان ہی ہوئی انسٹی ٹیوٹ میں عربی کی ابتدائی کلاس ایک یہ بھی لیتے ہیں۔

ظفر اسحٰق صاحب انصاری مولانا ظفر احمد انصاری جو تحریک پاکستان کے عہد میں یوپی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری اور الٰہ آباد کے ایڈوکیٹ تھے اور اب پاکستان کے مشہور قومی دلی کارکن ہیں۔ ان کے صاحبزادہ ہیں۔ بڑے لائق اور صالح نوجوان اور فکر و عمل کے اعتبار سے کٹر مسلمان ہیں۔ چہرہ پر خدا کا نور یعنی ڈاڑھی بھی ہے

انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد کئی سال ہوئے میکگل یونیورسٹی سے بھی ایم۔ اے کیا تھا۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کے لکچرر ہو گئے۔ اب آج کل وہاں سے بھی رخصت لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے مع اپنی بیوی اور بچی کے مونٹریل میں مقیم اور انسٹی ٹیوٹ میں داخل تھے۔ اردو تو خیر مادری زبان ہے ہی۔ انگریزی انشاء پر بھی بڑی قدرت ہے۔ ان کی اہلیہ مولانا محمد ناظم ندوی کی صاحبزادی ہیں۔ اس بنا پر کچھ آب و گل کا تعلق اور زیادہ تر اتحاد طبع و توافق مذاق! چند ہی روز میں انصاری صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ان کے گھر سے میرا بالکل قریبی اور عزیزوں کا سا رابطہ ہوگیا۔

میں بتا چکا ہوں کہ اُس وقت میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا اس لئے ان دونوں حضرات کو دیکھ کر جان میں جان آئی۔ میں نے علی گڈھ سے ہی آدم صاحب کو لکھ دیا تھا کہ مونٹریل میں قیام کے لئے میرا انتظام کسی اچھے اور متوسط درجے کے ہوٹل میں کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایک ہوٹل جس کا نام وارسالیز لاج (VERSAILLESS LODGE) ہے اور جو شہر کی مرکزی سڑک مغربی شیربرک پر واقع ہے اس میں ایک کمرہ کا انتظام کر دیا تھا۔ آدم صاحب کی کار میں بیٹھ کر ہم تینوں ہوائی اڈہ سے سیدھے یہیں آئے۔ مگر میرے لئے جو کمرہ تجویز کیا گیا تھا وہ اس وقت خالی نہیں تھا اس لئے اسی سے متصل ایک اور ہوٹل (BRUMET) ہے اس میں ایک کمرہ عارضی طور پر سات ڈالر یومیہ پر اور وہ بھی بغیر خوراک کے لے لیا۔ اور میں اس میں مقیم ہوگیا۔ جہاز جب مونٹریل پہنچا تھا اس وقت لندن کے ٹائم سے میری گھڑی میں ½ ۹ بجے تھے اور یہاں ½ ۴ بجے کا وقت تھا۔ چار گھنٹے کا فرق علی گڈھ اور لندن میں تھا۔ اس حساب سے اب علی گڈھ اور مونٹریل میں نو گھنٹے کا فرق ہوا۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے یہاں کے چھ بج گئے تھے اور سورج غروب ہونے والا تھا۔ وطن میں اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے یعنی ناشتہ کر کرا کے بچے اسکول جا چکے ہوں گے اور بیوی اور نوکر گھر کے کام کاج میں لگے ہوں گے۔ مونٹریل میں پارکنگ یعنی موٹر کار کھڑی کرنا ایک سخت ابتلا ہے۔ آپ ہر جگہ کار کھڑی نہیں کر سکتے۔ اور جہاں کر سکتے ہیں وہاں بھی علی الاطلاق نہیں۔ بلکہ ٹریفک کے اوقات مدوجزر کے حساب سے مختلف جگہوں کے لئے مختلف اوقات مقرر ہیں۔ کہیں صرف پندرہ منٹ کہیں نصف گھنٹہ۔ اور کہیں اس سے بھی کم یا زیادہ۔ آدم صاحب نے اسی وقت جہاں اپنی کار کھڑی کی تھی۔ وہاں صرف پانچ منٹ کی اجازت تھی۔ اس لئے انھوں نے ہوٹل میں میرا سامان ایک کمرہ میں رکھوا کر ہوٹل کے منیجر سے میرے متعلق ایک دو منٹ بات کی اور اگلے روز صبح کو آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئے۔ ان کے بعد انصاری صاحب کچھ دیر بیٹھے۔ ان کو غالباً اس کا احساس تھا کہ ہمارے ملک میں ایکسچینج کی کیا دقتیں ہیں۔ اس لئے جب یہ بھی رخصت ہونے لگے تو از خود ساٹھ ڈالر انھوں نے جیب سے نکال کر میرے حوالہ کئے۔ اور ساتھ ہی اپنا فون نمبر دیا کہ کسی قسم کی بھی کوئی ضرورت ہو تو میں انھیں مطلع کر دوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فون نمبر سن کر مجھے اس وقت تعجب ہوا کہ یہیں! ایک طالب علم اور ان کے کمرہ پر ٹیلیفون! مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ٹیلیفون، کار، ٹیلی ویژن اور ریفریجیٹر وہاں زندگی کے لوازم میں سے ہیں اور غریب یا امیر، چھوٹا یا بڑا کوئی گھر ایسا نہیں ہے جو ان چیزوں سے خالی ہو۔ انصاری صاحب کو گئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو ہندوستانی طالب علم آ گئے۔ ان میں ایک تو میاں مشیر الحق تھے جو ندوۃ العلما لکھنؤ میں تعلیم پانے کے بعد عربی میں ایم۔ اے کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ملازم ہو گئے تھے اور وہاں سے یہاں آکر اب اسلامیات میں ایم۔ اے کر رہے تھے اور انسٹی ٹیوٹ میں داخل تھے۔ (اب ایم۔ اے میں بہت اچھے ڈویژن میں کامیاب ہو کر پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخل ہیں) ان کے علاوہ دوسرے صاحب غالباً حیدر آباد کے تھے۔ ان کا نام یاد نہیں رہا ہے۔ یہ میکگل یونیورسٹی میں اکاؤنٹنسی کی کلاس میں داخل تھے۔ ان سے کچھ دیر وطن اور انسٹی ٹیوٹ کے حالات پر گفتگو رہی۔ ان کے رخصت ہونے پر میں معمولات شبانہ سے فارغ ہو کر لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انصاری صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے خیریت دریافت کی اور پوچھا کوئی کام تو نہیں ہے، میں نے شکریہ ادا کیا اور مسہری پر دراز ہو گیا۔ دوسرے دن صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ حسب وعدہ آدم صاحب آ گئے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر انسٹی ٹیوٹ میں آئے۔ انسٹی ٹیوٹ میری قیام گاہ سے دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ہو گا۔ مگر مونٹریل کی آبادی پہاڑوں کی آبادی جیسی ہے۔ وہی پہاڑوں جیسا رفع پست۔ نشیب و فراز اور وہی پہاڑوں جیسے بل کھاتے ہوئے راستے اور ان کے پیچ و خم۔ چنانچہ انسٹی ٹیوٹ بھی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ ہوٹل سے نکل کر چند قدم سیدھا جانا پڑتا ہے اور پھر "گے اسٹریٹ" (GAY STREET) اور شیر بروک اسٹریٹ کے کروسنگ پر پہنچ کر جب آپ بائیں جانب مڑیں گے تو اب چڑھائی ہی چڑھائی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ تک چڑھتے ہی چلے جائیں گے۔ اسی وجہ سے بیدل آنے جانے میں جانے وقت کم و بیش بیس منٹ لگتے تھے اور واپسی میں آٹھ نو منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے تھے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے دامن میں میکگل یونیورسٹی واقع ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے لئے ایک کئی منزلہ وسیع عمارت خود یونیورسٹی کے رقبہ میں بنے گی۔ اس کی باقاعدہ منظوری ہو چکی ہے۔ مگر میری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واپسی تک تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا تھا آج کل انسٹی ٹیوٹ عارضی طور پر جس بلڈنگ میں ہے۔ یہ پنچ منزلہ عمارت ہے پہلی دو منزلوں میں اساتذہ اور رفقا (FELLOWS) کے کمرے ہیں تیسری اور چوتھی منزل میں لائبریری اور بعض دفتر اور کلاس روم ہیں۔ چوتھی منزل پر ہی مطبخ مع کھانے کے کمرے کے ہے۔ پانچویں منزل پر پروفیسر اسمتھ کا کمرہ۔ ان کی اپنی لائبریری اور ان کا دفتر ہے جس میں خواتین کام کرتی ہیں۔ ان میں مسز ووڈ اسکا کی حیثیت سر دفتر کی ہے۔ یہ نہایت قابل مستعد اور بڑی ہمدرد و خلیق خاتون ہیں۔ علاوہ ازیں وسیع و کشادہ کامن روم جہاں شام کو چار بجے سب ایک ساتھ چائے پیتے اور باتیں کرتے ہیں اور سیمنار روم بھی اسی منزل میں ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کا تعلیمی سشن ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے طلبا اور اساتذہ کا تو ابھی کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ البتہ دفاتر کھلے ہوئے تھے اور پروفیسر اسمتھ اور ڈاکٹر آدم پابندی سے آتے تھے۔ اور صبح کے نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک یہیں رہتے تھے۔ اس لئے آدم صاحب مجھے لے کر سیدھے ڈائرکٹر کے کمرہ میں آئے۔ یہاں اسمتھ صاحب بڑی گرم جوشی سے ملے اور ایک خاص انداز میں اھلاً و سھلاً و مرحبا کہہ کر میرا خیر مقدم کیا۔ یہ حضرات کام کے اوقات میں گپ شپ اور غیر ضروری باتیں پسند نہیں کرتے اس لئے پانچ دس منٹ گفتگو کے بعد اسمتھ صاحب نے مجھ سے کہا کہ لنچ آپ میرے ساتھ کھائیے۔ اور میں اس کا وعدہ کر کے ان سے رخصت ہوا تو آدم صاحب مجھے لے کر اپنے کمرہ میں آئے اور یہاں پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ چونکہ انسٹی ٹیوٹ میں میرا تقرر ایک برس کے لئے (از اگست ۱۹۶۲ء تا جولائی ۱۹۶۳ء) ہوا تھا اس لئے اگست کے مہینہ کی تنخواہ کا چیک انھوں نے میرے حوالہ کیا۔ میں نے چاہا کہ رسید لکھوں اور وہ بھی ٹکٹ لگی ہوئی۔ مگر انھوں نے کہا "جی نہیں! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں یہ قاعدہ نہیں ہے۔" اور واقعی قارئین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہاں رسید دینے یا قبض الوصول پر دستخط کرنے کا کوئی دستور ہی نہیں ہے پورے سال کی تنخواہ ماہ بہ ماہ کے حساب سے وصول کر لی مگر آج تک کبھی کوئی رسید نہیں دی اور نہ کہیں وصولیابی کے دستخط کئے۔ پھر آپ کو یہ سن کر مزید تعجب ہوگا کہ وہاں ہر ماہ سب لوگوں کی تنخواہوں اور وظیفوں کے چک چھوٹی اور بڑی رقموں کے آتے بھی تھے تو کس طرح؟ چپراسی۔ بیرا۔ اور ملازم تو وہاں ہے ہی نہیں۔ یونیورسٹی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اکاؤنٹس آفس کی طرف سے ہر ایک کا چیک اس کے نام معمولی ڈاک کے ذریعہ بھیجا جاتا تھا اور عام خطوط کے ساتھ اسی طرح وہ بھی وصول ہو جاتا تھا۔ نہ رجسٹر پیش کرنے کی ضرورت تھی اور نہ بیمہ کی۔ اس موقع پر طبعاً آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوگی کہ میری تنخواہ کیا تھی؟ لوگ عام طور پر ایسی بات پوچھنا خلاف تہذیب اور ایسی بات بتانا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک مشاہرہ عصمتِ گناہ کے دامن کا کوئی چاک نہیں ہے جس کی پردہ پوشی ضروری ہو۔ اس لئے سنئے! اس کی داستان بھی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ہوا یہ کہ اسمتھ صاحب نے شروع میں جو خط لکھا تھا اس میں انہوں نے ہوائی جہاز سے آمد و رفت کے کرایہ کے علاوہ پانچ ہزار ڈالر اور اگر مجھ کو یونیورسٹی سے رخصت بلا تنخواہ ملی تو سو ڈالر ماہانہ میرے گھر کے لئے کی پیش کش کی تھی۔ اب اس کو میری کمزوری کہیے یا قلندری اور بے نیازی کہ میں نے عمر میں آج تک کبھی فکر بیش و کم نہیں کی۔ جو کچھ مل گیا اسے اللہ کا شکر ادا کرکے قبول کر لیا ہے۔[لہ]

لہ اور واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے ہمیشہ مجھے اس کا انعام دیا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۱ء میں جب میرا تقرر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں ہوا تو اگرچہ میں نے اس جگہ کے لئے درخواست نہیں دی تھی اور پرنسپل مکرجی نے از خود مجھ کو درخواست کی تھی لیکن میرا تقرر نامہ لکھاتے وقت جب پرنسپل صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کالج میں لکچرر کے دو گریڈ ہیں ایک جونیئر جو ڈیڑھ سو سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا سینئر جو دو سو سے چار سو تک کا ہے۔ میں ان دونوں میں سے کون سا گریڈ لوں گا؟ تو میں نے زرا تامل کہا کہ جو آپ پسند کریں۔ انھوں نے جونیئر گریڈ لکھا دیا اور میں نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ لیکن سال بھر کے بعد ہی کالج نے از خود مجھے سینئر گریڈ دے دیا اور گذشتہ ایک برس کے نقصان کی تلافی اس طرح کی کہ ساتھ ہی دو برس کی ترقی بھی دیدی۔ اسی قسم کا معاملہ میرے ساتھ کلکتہ میں ہوا جہاں دس برس تک میں کلکتہ مدرسہ کا پرنسپل اور حکومت مغربی بنگال کا فرسٹ کلاس گزیٹڈ آفیسر رہا۔ پھر وہاں سے علی گڑھ آیا تو یہاں بھی یہی معاملہ ہوا اور لطف یہ کہ ان تمام مذکورہ بالا جگہوں میں سے کسی جگہ کے لئے میں نے درخواست نہیں دی پھر سفارش تو کیا کرتا۔ جہاں کہیں رہا ہوں بلا منت غیرے رہا ہوں۔ اس جملۂ معترضہ کا مقصد خودستائی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ممکن ہے آج کل کے نوجوانوں کے لئے اس میں کوئی سبق اور عبرت ہو۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے انا عند ظن عبدی بی کی صداقت پر اتنا ہی یقین ہے جتنا توحید پر ہے اور میری زندگی کے واقعات اس علم و یقین کی شہادتوں سے صد لالہ بکنار ہیں۔ اقبال کا یہ شعر میری حقیقت حال کا ترجمان ہے۔

نظر ہے ابر کرم پر درختِ صحرا ہوں — کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھکو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ میں نے یہ پیش کش بھی کسی رد و کد یا چون و چرا کے بغیر منظور کر لی۔ لیکن یہاں پہنچنے پر اسمتھ صاحب نے بتایا کہ یونیورسٹی کی متعلقہ کمیٹی کے سامنے میرا معاملہ پیش ہوا تو اس نے سات ہزار دو سو ڈالر میرا مشاہرہ مقرر کر دیا۔ اور اب اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ علی گڈھ یونیورسٹی سے رخصت با تنخواہ ملی ہے یا بغیر تنخواہ۔ اس حساب سے اگست ۱۹۶۲ء کے مہینہ کا مجھے جو چیک ملا وہ چھ سو ڈالر کا تھا۔ اب آدم صاحب نے مجھے لے کر انسٹی ٹیوٹ کا ایک چکر لگایا اور اس کا کتب خانہ اور دفاتر وغیرہ دکھائے۔ پھر کار میں بیٹھ کر رائل بنک آف کناڈا کی اس شاخ میں پہنچے جو میری قیام گاہ سے قریب تھی اور یہاں انھوں نے میرا اکاؤنٹ کھولنے کی کارروائی کی جس میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔ یہ سب کچھ کرتے کراتے ساڑھے بارہ بج گئے تھے ایک بجے لنچ کا وقت ہوتا ہے اس لئے میں حسب وعدہ یونیورسٹی کے اسٹاف کلب یا سینئر کامن روم پہنچا تو اسمتھ صاحب وہاں موجود تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ یہ کلب یونیورسٹی کے علاقہ میں ہے۔ اس میں چند کمرے بھی بنے ہوئے ہیں جن میں یونیورسٹی سے متعلق لوگ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ جو اس کلب کے ممبر ہیں ان کو یہ فائدہ ہے کہ وہ جب چاہیں تنہا یا مہمانوں کے ساتھ لنچ یا ڈنر کھا سکتے ہیں بل کی ادائگی نقد نہیں کرنی ہوتی۔ حساب میں اندراج ہو جاتا ہے اور مہینہ کی تنخواہ میں سے وہ رقم وضع ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسری اشیاء مثلاً سگریٹ وغیرہ بھی اسی طرح ملتی ہیں۔ لنچ پر اسمتھ صاحب نے کھل کر بات چیت کی اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ذکر آیا کہ انسٹی ٹیوٹ میں میرے کام کی نوعیت کیا ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ اس سال دو سیمنار ہو رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ اور میں دونوں مل کر ان کی قیادت (LEED) کریں۔ ایک سیمنار جو دو ٹرم یعنی پورے تعلیمی سال کا ہے اور اس لئے پورا کورس ہے اس کا موضوع ہوگا "ہندوستانی مسلمانوں کی تحریکیں ــــ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے کر ملک کی تقسیم اور پاکستان بننے تک ــــ اور دوسرا سیمنار ہوگا تفتازانی یعنی علم الکلام پہ۔ یہ سیمنار صرف ایک ٹرم کا ہوگا جو ستمبر سے شروع ہو کر دسمبر میں ختم ہو جائے گا اور اس لئے آدھا کورس ہوگا۔ یہ دونوں سیمنار کس طرح ہوئے اور انسٹی ٹیوٹ بلکہ پوری یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں اس کی کیا اہمیت ہے اس کا تفصیلی تذکرہ تو اپنی جگہ پر آئے گا۔ یہاں جتنی بات ہوئی اس کا ذکر کرنا ہے۔ میں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچ کے بعد ہم دونوں جدا ہو گئے۔

پہلے گذر چکا ہے میرا اس ہوٹل میں قیام عارضی تھا۔ دو دن کے بعد وارسا لاج میں جو ٹورسٹ ہوٹل ہے میں مستقل طور پر منتقل ہو گیا۔ عجیب بات ہے مجھ سے پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر محمد مجیب ایک ٹرم کے لئے یہاں آئے تھے تو وہ بھی اسی میں مستقلاً رہے تھے اور جو کمرہ مجھے ملا تھا اتفاق سے وہ بھی اُن کے کمرہ سے متصل تھا۔ وہاں قیام کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں کسی فیملی میں ضیف معطی" (PAYING GUEST) ہو کر رہتا اور یا کوئی الگ کمرہ (APARTWENT) لے کر رہتا۔ اگرچہ یہ دونوں صورتیں نسبتہً سستی رہتیں۔ لیکن فیملی میں رہنے سے کھانے پینے میں اور بعض اور معاملات میں دوسروں کا پابند ہونا پڑتا اور الگ کمرہ کی شکل میں کمرہ کی صفائی ستھرائی اور کھانا ناشتہ وغیرہ خود تیار کرنا ہوتا جو میرے بس سے باہر تھا اس لئے یہ انتظام گراں تو پڑا مگر عافیت اسی میں نظر آئی اور میں نے مستقل طور پر ہوٹل میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں مجکو فی ہفتہ بیالیس ڈالر دینے ہوتے تھے اور اس میں علاوہ رہائش کے صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا شامل تھا۔ اس طرح کے عام ہوٹلوں کی طرح پنچ تو بالکل ہی غائب تھا۔ رہا ڈنر تو وہ بھی اتوار کی شب میں یا کسی خاص نیز تہوار کے موقع پر نہیں ہوتا تھا۔ سب سے بڑا آرام یہ تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا نہیں پڑتا تھا۔ ناشتہ کے بعد ایک لڑکی آتی تھی اور وہ بستر درست کرتی تھی ہر تیسرے دن مسہری کی ڈبل چادریں، دو دو تکیوں کے غلاف بدلتی تھی۔ چادر تولئے اور دو قسم کے صابن جو ہر وقت رہتے تھے انھیں بدلتی تھی۔ کمرہ کا فرنیچر ٹھیک ٹھاک کرتی اور باتھ روم کی صفائی کرتی تھی۔ دروازہ اور کھڑکی کے پردے مہینہ میں دو مرتبہ بدلے جاتے تھے۔ بجلی کی بھاپ کے ذریعہ کمرہ کی فضا کو مضر صحت جراثیم سے پاک و صاف کیا جاتا تھا۔ کھانے یا ناشتہ کا وقت ہوا اور ڈائننگ ہال میں جا کر بیٹھ گیا اور جو کچھ کھانا بنیا ہوا کھا پی لیا۔ اور کسی دن دو چار دوستوں کو مدعو کرنا ہوا تو صرف ایک پرچہ لکھ کر اطلاع کر دیجیے پر اُس کا خاطر خواہ انتظام ہو گیا۔ پھر ٹیلیفون بجائے ایک کے دو۔ غرض یہ کہ یہ سہولتیں تھیں جن کی وجہ سے میں نے نسبتہً زیادہ خرچ گوارا کیا مگر رہا ہوٹل میں۔ وہاں نوکر چاکر، باورچی اور خانساماں تو کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں اس لئے جو ہوٹل کا مالک تھا وہ خود ہم کو کھانا کھلاتا تھا۔ اُس کا ایک بھائی کھانا پکاتا تھا اور ایک بھائی برتن دھوتا اور صاف کرتا تھا۔ گویا ہوٹل کا مالک اور منیجر خود ہی ویٹر (WAITER) بھی تھا اور اس میں اس کو یا اس کے گھر کے کسی آدمی کو عار نہیں آتی تھی۔

(باقی)

© rasailojaraid.com